خدا اور خودی

سلیم چشتی

اس کائنات میں انسان، حیات کی آخری ارتقائی منزل ہے اور جو چیز اسے جمیع حیوانات سے متمیز کرتی ہے وہ اس کا ذاتی شعور ہے یعنی یہ احساس کہ میں موجود ہوں۔ بالفاظ دگر یہی شعور ذات خویش، حیوانات اور انسان میں مابہ الامتیاز ہے۔

چونکہ انسان سے بالاتر اور کوئی مخلوق ابھی تک عالم وجود میں نہیں آ سکی ہے اس لئے ہم استخراجی منطق کی روشنی میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ آئیندہ ارتقا' اگر ہوگا (اور عقل کا تقاضا ہے کہ یہ سلسلہ یونہی جاری ہے) تو انسان کے ذاتی شعور ہی میں ہوگا۔ اس شعور ذات کا قدرتی نتیجہ احساس حریت ہے یعنی ہر ذی شعور انسان اپنے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں یہ محسوس کرتا ہے کہ میں ایک آزاد فرد ہوں۔ یہ آزادی (حریت النفس) میرا پیدائشی حق ہے، انسان کو مجھ پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہہ ہے کہ ہر انسان غلامی سے بالطبع نفرت کرتا ہے۔ اور جس طرح فرد غلامی سے نفور ہے اسی طرح کوئی قوم بھی غلامی پہ رضامند نہیں ہوسکتی کیونکہ قوم افراد ہی کے مجموعے کا دوسرا نام ہے۔

اسلام دین فطرت ہے، انسان کے فطری تقاضوں کی تکمیل کا خدائی دستور العمل ہے اسی لئے قرآن نے انسان کو توحید کا درس دے کر حریت ہی کی نعمت سے مالا مال نہیں کردیا بلکہ تین نعما' مزید عطا فرمائیں یعنی عصمت، مال ودم۔ ملکیت اور ولایت (قبضے اور حکومت کا شرعی حق) ۔۔

شعور ذات کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ انسان میں جمال کا احساس پیدا ہوتا ہے چنانچہ اسے پھول، تتلی، شفق، جملہ مناظر قدرت اور بعض مظاہر فطرت، عمارات، شعر و شاعری، مصوری، موسیقی، سنگتراشی، خطاطی، مصنوعات، الوان مختلفہ اور بعض اعضائے جسمانی میں حسن و جمال کا

حساس ہوتا ہے۔ اور یہ احساس رفتہ رفتہ اسے منبعٔ حسن و جمال کی طرف مائل کردیتا ہے اور اس کے حصول کو وہ اپنا مطمح نظر اور نصب العین قرار دے لیتا ہے، بشرطیکہ غلط خیالات یا عقائد اس کی راہ میں حائل نہ ہوجائیں جو اسے صحیح نصب العین سے منحرف کردیں۔ حدیث نبوی میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے" کل مولود یولد علی الفطرت فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او لمجسانہ ،، ہر بچہ فطرت صحیحہ (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

چونکہ جمال مطلق (حق تعالی) اس کا نصب العین بنجاتا ہے اس لئے وہ اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی جذبہ حصول کو عرف عام میں " عشق ،، کہتے ہیں جس کے لئے قرآن حکیم نے " حب،، کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جب عشق پیدا ہوجاتا ہے تو انسان کا شعور ذات اپنے درجہ کمال کو پہنچ جاتا ہے، یعنی جب انسان کو یہ شعور حاصل ہوجاتا ہے کہ میں عاشق ہوں تو شعور ذات کی تکمیل ہوجاتی ہے۔ جب تک ایک مسلمان کو اپنے عاشق ہونے کا احساس نہ ہو، اس کا شعور ذات ناقص رہتا ہے—

اسلام، انسان کو محبوب حقیقی (اللہ تعالی) سے ملنے کا طریقہ بھی سکھاتا ہے۔ اور یہ بھی تلقین کرتا ہے کہ عشق ہی مومن کا طغرائے امتیاز ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے :—

والذین امنوا اشد حباً للہ (یعنی جو لوگ مومن ہیں ان کی شناخت یہ ہے کہ وہ اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

اقبال نے اسی صداقت کو یوں نظم کیا ہے :—

طبع مسلم از محبت ناصر است مسلم از عاشق نباشد کافر است

یعنی جو مسلمان عاشق نہیں ہے وہ کافر ہے۔ کسی کو یہ شبہ نہ گذرے کہ یہاں اقبال نے شاعری کی ہے۔ یہ شاعری نہیں ہے حقیقت ہے۔ وہ مکرر کہتے ہیں :—

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

قرآن نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ اے مومنو! اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو رسول اللہ (صلعم) کی غلامی اختیار کرو :-

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (اے رسول مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اے مسلمانو! اگر تم اللہ سے محبت کرنے کے آرزومند ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ میری اتباع (غلامی) کرو (اس کا ثمرہ یہ ملے گا کہ) اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا)۔ اس آیت سے محبت کرنے کا طریقہ بھی معلوم ہوگیا اور اتباع رسول کی اہمیت بھی واضح ہوگئی۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خود ارشاد فرماتے ہیں :-

لا یومن احدکم حتیٰ کون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین (رواۃ البخاری) اے مسلمانو! تم میں کوئی شخص حقیقی معنی میں مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کی نگاہ میں اس کے والد اور فرزند اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ یہ شبہ نہ گذرے کہ قرآن نے تو لفظ ''اتباع،، استعمال کیا ہے اور اس حدیث نے ''محبت رسول،، کا درس دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اتباع رسول بدون محبت رسول محال عادی ہے۔ جب تک ایک شخص آپ سے محبت نہ کرے وہ آپ کی اتباع کرہی نہیں سکتا۔ اتباع، محبت پر موقوف ہے جس طرح قیام سقف قیام جدار پر موقوف ہے یا جس طرح نہار، طلوع شمس پر موقوف ہے۔

اسوہ رسول مسلمان سے کہتا ہے کہ اگر قرب حق مطلوب ہے تو نماز پڑھو۔ اللہ کو ڈھونڈنے کا سب سے اعلی اور افضل طریقہ نماز ہے۔ جیسا کہ حضور فرماتے ہیں :-

الصلوۃ عماد الدین فمن اقامھا فقد اقام الدین ومن ترکھا فقد ھدم الدین،، (یعنی نماز، دین کا ستون ہے، پس جس نے اسے قائم کیا اس نے اپنے دین کو قائم کیا اور جس نے اسے ترک کیا، اس نے اپنے دین کو ڈھادیا۔

اقبال کہتے ہیں :-

لا الہ باشد صدف، گوھر نماز — قلب مسلم را حج اصغر، نماز
در کف مسلم مثال خنجر است — قاتل فحشاؑ و بغیؑ و منکراست
(اسرار خودی)

لیکن جب تک ایک مسلمان کو آنحضرت صلعم سے عشق نہ ہو وہ آپ کی تقلید (اتباع) نہیں کرسکتا اور تقلید کے بغیر نماز پر مواظبت نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے اقبال نے مسلمانوں کو تقلید رسول کا درس دیا ہے: —

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق
ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
کامل بسطام، در تقلید فرد
اجتناب از خوردن خربوزہ کرد
عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار
تا کمند تو کمند یزداں شکار
اند کے اندر حرائے دل نشیں
ترک خود کن سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو، سوئے خود گام زن
لات و عزائے ہوس را سر شکن
لشکرے پیدا کن از سلطان عشق
جلوہ گر شو، بر سر فاران عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شمع "انی جاعل" سازد ترا

(اسرار خودی)

بہر کیف تقلید یا اتباع، دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور ان کا وجود عشق پر موقوف ہے بلکہ بقول اقبال جب تقلید کامل ہوجاتی ہے تو اسے عشق کہنے لگتے ہیں۔

نماز کیا ہے؟ یہ دراصل جمال کے عرفان (Gnosis) کی شدید آرزو ہے یعنی جمال مطلق کے تصور (دھیان) کا دوسرا نام ہے اور تمام عرفا کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اسی دھیان سے گیان (عرفان) پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے بھگت کبیر نے یہ فرمایا ہے "پریم کے سمندر میں ڈوب جاؤ کیونکہ پریم بنا، دھیان نہیں ہوسکتا اور دھیان بنا، گیان نہیں ہوسکتا اور گیان بنا، اطمینان نہیں ہوسکتا"۔

جب غیر عاشق نماز پڑھتا ہے تو وہ محض ایک رسم ادا کرتا ہے۔

اس کی نماز اس جسم سے مشابہ ہوتی ہے جس میں روح نہ ہو یا اس پھول سے مشابہ ہے جس میں خوشبو نہ ہو۔ لیکن جب عاشق نماز پڑھتا ہے تو وہ اپنے اس یقین کا عملاً اظہار کرتا ہے کہ اللہ، جو محبوب حقیقی ہے، جمیل ہے اور جمیل ہی نہیں ہے بلکہ منبع حسن و جمال بھی ہے۔

جو شخص نماز نہیں پڑھتا، اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ غیر فطری زندگی بسر کرتا ہے کیونکہ محبوب حقیقی کی جستجو اور اس سے ملنے کی خواہش ہر سلیم الطبع انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اب جو شخص اپنے محبوب سے ملنے کی کوشش نہیں کرتا وہ گویا اپنی فطرت کے تقاضے کو پورا نہیں کرتا یعنی خلاف فطرت زندگی بسر کرتا ہے۔

جو شخص عاشق ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے اسے کبھی کوئی حزن ملال یا رنج و الم لاحق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ حزن و ملال، ذاتی خواہشوں کے پورا نہ ہونے کا نتیجہ ہے اور عاشق، ذاتی خواہشات سے بالکل پاک ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی مرضی کو محبوب کی مرضی میں فنا کردیتا ہے۔ جب تک ذاتی خواہشات باقی ہیں، عشق ناقص رہتا ہے۔ جب عشق کامل ہوجاتا ہے تو عاشق کی ذاتی مرضی فنا ہوجاتی ہے۔

اصلی مصیبت، مفلسی یا قید و بند نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ عاشق اپنے محبوب (مقصود حیات) سے غافل ہوجائے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے :

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راهم دور شد

نماز، انسان کا بلند ترین، تجربہ حیات ہے، اس سے بلند تر کوئی تجربہ نہیں ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں انسانی شعور اپنے مرکز اور مقصد اور منبع سے رابطہ پیدا کرتا ہے اور چونکہ اس مصدر سے بالا تر کوئی حقیقت نہیں ہے، اس لئے تجربے سے بالا تر کوئی تجربہ بھی نہیں ہوسکتا۔ نماز کیا ہے؟ اقبال کی اصطلاح میں، خودی کا اپنی منزل مقصود کی طرف سفر ہے۔ یعنی عاشق کی اپنے معشوق سے ملاقات ہے۔ اسی لئے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''الصلوۃ معراج المومنین''، یعنی نماز، دراصل مومن کی معراج ہے جس میں اسے اپنے خالق سے قرب نصیب ہوتا ہے۔

نماز میں جمال مطلق کے نئے نئے پہلو عاشق پر منکشف ہوتے ہیں

جن کو تصوف کی اصطلاح میں '' احوال ،، کہتے ہیں۔ جب یہ احوال، عاشق کی عقلی اور جذباتی زندگی میں ایک عنصر فعال یا زندہ عامل (Living factor) کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں تو اس روحانی حالت یا کیفیت کو '' مقام ،، سے تعبیر کردیتے ہیں ۔ یہ وہ کیفیت ہے جب عاشق (سالک) نماز کے اقتضا پر اسی طرح عمل کرتا ہے۔ جس طرح ایک ماں، تقاضائے امومت پر عمل کرتی ہے۔ اور جب یہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے تو عاشق کی زندگی میں نماز کے وہ ثمرات سہ گانہ بھی مرتب ہوجاتے ہیں جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے :

ان الصلوۃ تنھی عن الفحشآ والمنکر والبغی : بیشک نماز انسان کو بے حیائی کے کاموں اور خلاف شرع امور اور سرکشی (بغاوت) سے باز رکھتی ہے۔

یہاں قرآن نے تین لفظ استعمال کرکے انسانی شخصیت کے تینوں پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے :—

(a) '' فحشآ ،، کا تعلق انسان کی قوت شہوانی سے ہے۔ جب یہ جذبہ غالب آجاتا ہے تو انسان فواحش (بے حیائی کے کاموں) کا مرتکب ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر حیوان بنجاتا ہے ۔

(b) '' منکر ،، کا تعلق انسان کی قوت غضبیہ سے ہے جب یہ جذبہ مستولی ہوجاتا ہے تو انسان ظلم و ستم اور جور و تعدی کا ارتکاب کرتا ہے۔ بالفاظ دگر درندہ بنجاتا ہے

(c) '' بغی ،، کا تعلق انسان کی قوت واھمہ سے ہے۔ جب یہ قوت عقل سلیم پر غالب آجاتی ہے تو انسان سرکشی (انکار) پر تل جاتا ہے۔ بالفاظ دگر شیطان بنجاتا ہے ۔

یہاں یہ نکتہ بھی لائق غور ہے کہ قرآن کے نازل کرنے والے نے (چونکہ وہ خالق فطرت انسانی ہے) ان معائب کے تذکرے میں خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔ پہلے فحشا، پھر منکر، آخر میں بغی ۔ کیونکہ بغاوت سے اوپر، خباثت باطنی کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

نماز کی روح کیا ہے ؟ معشوق کے سامنے اپنی ہستی کو مٹادینا ۔ اور قیاماً، رکوعاً، جلوساً، قعوداً اور سجوداً غرضکہ ہر ممکن وضع سے یہ کہنا

کہ میں نہیں ہوں، تو ہی تو ہے! (۱) تیری ہستی کے سامنے میری کیا ہستی ہے! کیا آفتاب کے سامنے جگنو روشنی کا دعوی کرسکتا ہے؟ ایک ''طلسم بود و عدم،، کا یہ حوصلہ کہاں کہ وہ منبع وجود کے سامنے، اپنے وجود کا اثبات کرسکے؟

ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ نماز میں عاشق (سالک) کو اپنی ہیچ مائیگی اور احتیاج و افتقار ذاتی کا شدید ترین احساس ہوتا ہے۔ یہی احساس تو اسے سجدہ ریزی پر مائل کردیتا ہے۔ اگر یہ احساس ہر حرکت اور ہر سکون میں کار فرما نہ ہو تو نماز ایک رسم لا یعنی یا ایک عمل میکانکی بن کر رہ جائے گی۔ (اس جگہ یہ لکھنا شاید خلاف محل نہ ہو کہ آج کل ہماری نمازیں ''الاماشاءاللہ،، ایک عمل میکانکی ہی بن کر رہ گئی ہیں۔ جب ہی تو سجدوں سے وہ ثمرات مرتب نہیں ہوتے جو کسی زمانے میں ہوا کرتے تھے)۔

عاشق کو جمال مطلق کے جمال کا جسقدر احساس ہوتا جاتا ہے عاشق اسی قدر ماسوی یا غیر اللہ سے بے نیاز ہوتا جاتا ہے۔ یعنی فلسفہ کی زبان میں حریت کاملہ سے ہم کنار ہوتا جاتا ہے۔ اسی کیفیت کو علامہ اقبال مرحوم نے یوں بیان کیا ہے:—

بے نیازی رنگ حق پوشیدن است
رنگ غیر از پیرہن شوئیدن است

عاشق کو جس قدر معشوق کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اسی قدر اپنی احتیاج واضح ہوتی جاتی ہے۔ اور قرآن کی یہ آیت اس کے لئے حقیقت بنجاتی ہے

یا ایہا الناس انتم الفقرآ الی اللہ واللہ ہوالغنی الحمید:

اے لوگو! تم سب اپنے وجود کے لئے اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو وہ غنی اور حمید ہے۔

---

۱ — اثر صہبائی سیالکوٹی نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے۔

جب آئینہ دل کا روبرو ہوتا ہے
جلوہ تیرا ہی ہو بہو ہوتا ہے
یوں غرق مئے جمال ہو جاتا ہوں
میں ہوتا کہاں ہوں؟ توہی تو ہوتا ہے

عاشق پر منبع جمال کی حقیقت جس قدر منکشف ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کے دل میں حصول قرب کی آرزو پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یعنی وہ اسے اپنے اندر جذب کرلینا چاہتا ہے۔ وہ اس سے ہم آغوش ہوجانا چاہتا ہے، اس لئے بے اختیار اس کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی محویت اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ ساری کائنات اس کی نگاہ میں معدوم ہوجاتی ہے۔ اور وہ جس طرف نگاہ اٹھاتا ہے اسے اپنا محبوب ہی نظر آتا ہے۔ کما قال :—

سمایا ہے تو جب سے نظروں میں میری
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے
کجا غیر و کو غیر و نقش غیر
سوی اللہ، واللہ مافی الوجود

اس منزل میں زمان و مکان دونوں گم ہوجاتے ہیں اور اسے کائنات میں اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ۔ اسی منزل کا نقشہ اقبال نے یوں کھینچا ہے :—

بر سر ایں باطل حق پیرہن
تیغ ''لاموجود الاھو،، بزن

الغرض سالک عشق الٰہی میں اس درجہ مستغرق ہوجاتا ہے کہ بعض اوقات اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں، وہی ہوں۔ لیکن یہ احساس عارضی ہوتا ہے۔

جب عاشق (سالک) حالت سکر سے حالت صحو میں آتا ہے تو فوراً اپنی عبدیت کا اعتراف کرتا ہے۔ حالت استغراق میں اس کی مثال اس لوہے کی سی ہے جو اگ میں پڑکر، آگ کے خواص پیدا کرلیتا ہے۔ وہ آگ تو نہیں ہوجاتا مگر آگ سے جدا بھی نہیں ہوتا :

مردان خدا، خدا نباشند
لیکن ازخدا، جدا نباشند

مرشد رومی نے اس حالت کو ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے :—

صبغۃ اللہ ہست رنگ خم ہو
پیسہا یک رنگ گردد اندرو
چوں دراں خم افتد و گوئیش قم
از طرب گوید منم خم، لاتلم

آں منم خسم، خود اناالحق گفتنی ست
رنگ آتش دارد، الا آهنی ست
رنگ آهن محو رنگ آتش است
زآتشی می لافد و خامش وش است
چوں بسر خی گشت همچو زر کاں
پس انا النار امت لافش بیگماں (۱)
اتشم من، گر ترا شک است و ظن
آزموں کن، دست را برمن بزن

حالت استغراق میں اگر چہ عاشق اپنی اصل کے اعتبار سے عبد ہی رہتا ہے مگر فنا فی اللہ ہوجانے کی وجہ سے امتیاز قیما میں دشوار ہوجاتا ہے۔ جس طرح آگ کے اندر لوہا اور انگارہ بظاہر یکساں ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جس طرح آگ سے باہر آجانے کے بعد لوہا پھر اصلی حالت پر واپس آجاتا ہے اسی طرح سالک جب عالم لاہوت سے واپس آتا ہے تو وہ بندہ ہی ہوتا ہے اور واپس آنا اس لئے ضروری ہے کہ عاشق یا سالک کا مقصد، اپنے محبوب کی رضا حاصل کرنا ہوتا ہے اور حصول رضا حالت صحو کے بغیر ناممکن ہے۔

اسلام یہی سکھاتا ہے کہ مقصد حیات، استرضا باری تعالی ہے۔ کیونکہ بندہ، اپنے مولی کی جنت میں اسی وقت داخل ہوسکتا ہے جب وہ اس سے راضی ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

یا ایتھاالنفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی :

اے نفس مطمئنہ ! اپنے رب کی طرف واپس آجا اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے پس داخل ہوجا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں ۔

اسی لئے عاشق وصل نہیں چاہتا بلکہ قرب چاہتا ہے، کیونکہ وصل کے بعد جد و جہد ختم ہوجاتی ہے اور جب جد وجہد ختم ہوگئی تو زندگی بھی ختم ہوگئی۔ کماقال اقبال :۔

---

(۱) بے زبان۔

تو نشناسی هنوز، شوق بمیرد زوصل
چیست حیات دوام؟ سوختن نا تمام

چنانچہ وہ قرب حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتا رہتا ہے اور اس طرح مسلسل مدارج قرب طے کرتا رہتا ہے :

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

قرآن حکیم بھی یہی فرماتا ہے '' فلھم اجر غیر ممنون ،،(لیکن جو لوگ ایمان لاکر اچھے کام کریں گے تو انہیں ایسا اجر ملے گا جو کبھی ختم نہ ہوگا)—

عاشق جانتا ہے کہ کمال زندگی گم ہوجانے میں نہیں ہے بلکہ روز بروز مدارج قرب طے کرنے میں ہے۔ کما قال اقبال :

بہ بحرش گم شدن انجام ما نیست
اگر او را تو در گیری فنا نیست

عاشق جانتا ہے کہ کمال زندگی ملاقات میں ہے—

کمال زندگی دیدار ذات است
طریقش رستن از بند جہات است

چونکہ کمال زندگی محبوب کو راضی کرنے یا اس کی خدمت کرنے میں ہے اسی لئے اسلام نے اجتماعیت پر اس قدر زور دیا ہے، کیونکہ انسان سوسائٹی میں رہ کر ہی بنی آدم کی خدمت کرسکتا ہے اور بنی آدم کی خدمت ہی خدا کی خدمت ہے۔ کیا خوب کہا ہے سعدی نے :

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

فرد کی خودی، اگر غور سے دیکھو تو اجتماعی زندگی بسر کرنے سے ہی تکمیل حاصل کرتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے جماعتی زندگی کو شرط اسلام قرار دیا ہے اور اسی لئے اقبال نے یہ لکھا ہے کہ غور سے دیکھو تو اسلام، ایک مخصوص ہیئۃ اجتماعیہ' انسانیہ کا دوسرا نام ہے۔

جس طرح خدا ساری خدائی کا بھلا چاہتا ہے، اور کسی پر ظلم روا نہیں رکھتا کما قال ''ان اللہ لیس بظلام للعبید ،، (بیشک اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا) اسی طرح عاشق بھی ساری خدائی کے غم میں گھلتا رہتا ہے۔ بقول امیر :

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

حضرات خواجگان چشت کی زندگیاں اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں۔ سیر الاولیاؑ میں مرقوم ہے کہ جب خادم نے حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی سے یہ عرض کی کہ اس قدر سوکھی روٹی نہ کھائیے کہ حلق سے بمشکل نیچے اترتی ہے تو آپ نے جواب دیا کہ '' نوالہ میرے حلق سے کس طرح نیچے اترسکتا ہے جب کہ اسی دلی میں ہزاروں آدمی رات کو بھوکے سوتے ہیں ،، سیر الاولیاؑ فوائدالفوادؑ اور راحۃالقلوب میں اس قسم کے بہت سے واقعات مندرج ہیں ۔ من شآء فلیراجع ۔

عشق ، انسان کی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کردیتا ہے۔ عاشق بنی آدم کے لئے ایثار مجسم بنجاتا ہے۔ اسے دوسروں کی خدمت میں سب سے زیادہ راحت محسوس ہوتی ہے۔ وہ خود کھاکر اس قدر مسرور نہیں ہوتا جس قدر دوسروں کو کھلاکر مسرور ہوتا ہے۔یہ اور دوسری خوبیاں اس میں محض عشق کی بدولت پیدا ہو جاتی ہیں اور جب صفات حسنہ کا غلبہ ہوجاتا ہے تو صفات رذیلہ خود بخود زائل ہوجاتی ہیں اسی لئے مرشد رومی نے عشق کو '' طبیب جملہ علتہائے ما ،، قرار دیا ہے :

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
وے طبیب جملہ علت ھائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما

چونکہ عاشق میں صفات حسنہ پیداؑ ہوجاتی ہیں اس لئے وہ بیخوف ہوجاتا ہے، یعنی وہ اپنے محبوب (کی ناراضگی) کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتا۔ اور چونکہ خوف '' ام الخبائث ،، ہے اس لئے وہ ہر قسم کے عیوب سے پاک ہوجاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں :

ھر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

چونکہ عاشق خدا سے ڈرتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا اس سے ڈرنے لگتی ہے :

بادشاہاں در قباہائے حریر
رزد رو از سہم آں عریاں فقیر

سعدی نے کیا خوب لکھا ہے :—

توہم گردن از حکم داور پیچ
کہ گردن نہ پیچد زحکم تو ہیچ

اور بات بھی یہی ہے کہ جب ایک انسان (عاشق) سچے دل سے خدا کا ہوجاتا ہے تو خدا بھی اس کا ہوجاتا ہے اور جب اللہ مل گیا تو بندہ بلاشبہ مولی صفات ہوجاتا ہے :

فقر موہن چیست ؟ تسخیر جہات
بندہ از تاثیر او، مولی صفات

سارا افسوس اس بات کا ہے کہ ہم دنیا والوں کو نافع اور ضار سمجھتے ہیں اس لئے ان کے آگے سرتسلیم بھی خم کرتے ہیں ! اور انہیں سجدہ بھی کرتے ہیں حالانکہ اللہ کے سوا اس کائنات میں کوئی ہستی ہمیں نفع یا نقصان نہیں پہونچا سکتی۔ اگر یہ عقیدہ جو کلمۂ طیبہ لا الہ الااللہ سے مستنبط ہے دل میں جاگزیں ہوجائے تو انسان غیر اللہ کے سامنے کبھی سرتسلیم خم نہ کرے۔ عشق میں یہ خاصیت ہے کہ وہ غیر اللہ سے بے نیاز کردیتا ہے۔ عاشق کے دل میں غیر اللہ کا خیال بھی نہیں آتا۔ کیونکہ عشق تو شرکت سوز ہوتا ہے : ع

ماند الااللہ ، باقی جملہ سوخت
شاد باش اے عشق شرکت سوز و زفت (رومی)

اسی لئے اقبال کہتے ہیں کہ انسان اگر توحید کے مفہوم سے آگاہ ہوجائے تو جان دیدیگا مگر غیر اللہ کے سامنے گردن نہیں جھکائے گا—

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

دیکھ لو! حضرت مجدد الف ثانی نے قید و بند کے مصائب گوارا کرلئے مگر جہانگیر کو سجدۂ تعظیمی (زمیں بوس) نہیں کیا: صالح اقبال کہتے ہیں:

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار

بات یہ ہے کہ عشق کی پہلی تاثیر یہ ہے کہ عاشق کے اندر شعور ذات بیدار ہوجاتا ہے اور جس کا شعور ذات بیدار ہوجائے وہ شخص غیر اللہ کی اطاعت یا غلامی نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عاشق صادق (خدا کا عاشق) دنیا میں کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ آستانہ یار اسے تمام دنیاوی آستانوں سے بے نیاز کردیتا ہے۔

شعور ذات اور غلامی میں بتاین کی نسبت ہے اس لئے یہ دونوں کیفیتیں، بیک وقت کسی شخص میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ ایک شخص اللہ کا عاشق بھی ہو اور کسی انسان کی اطاعت یا غلامی پر بھی رضامند ہوجائے، اسی لئے اقبال کو یورپ کے بجائے ہم سے شکوہ تھا اور اب بھی ہے۔

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھکو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

شعور ذات کا مطلب کیا ہے؟ مختصر لفظوں میں یہ کہ کسی شخص کا یہ احساس کرنا کہ میں (۱) اشرف المخلوقات ہوں (۲) خلیفۃ اللہ فی الارض کا مصداق ہوں (۳) اس کائنات میں کوئی شئی یا ہستی مجھ پر حکمراں نہیں ہے کیونکہ عقلاً ہو نہیں سکتی۔ آخری جملے کی توجیہہ یہ ہے:—

(الف) اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے یا میری برابر ہے یا مجھ سے کمتر ہے۔

(ب) کمتر کے آگے سر جھکانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) اب رہ گئیں وہ ہستیاں جو میری برابر ہیں تو جب وہ سب میری طرح ممکن الوجود یعنی حادث، مخلوق مفتقر الی اللہ، محتاج اور فانی ہیں تو پھر ان کے آگے سر جھکانا سراسر حماقت اور نادانی ہے

(د) اس لئے ان میں سے کسی کو مجھ پر حکومت کرنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔ اگر وہ مجھ پر حکومت کرسکتی ہیں تو

میں خود ان پر حکومت کیوں نہ کروں ؟ اسی نکتے کو اقبال مرحوم نے یوں بیان کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ کمال کردیا ہے

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد وجم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگاں سر خم کرد

خلاصہ' کلام اینکہ لا الہ الا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی الہ (واجب الوجود) مستحق عبادت، آمر اور حاکم علی الاطلاق نہیں ہے۔

اسی کو عرف عام میں توحید کہتے ہیں اور توحید کا مفہوم صرف عاشق ہی سمجھتا ہے کیونکہ وہی اس کے اقتضا' پر عمل کرتا ہے اور اپنے طرز عمل سے ثابت کردیتا ہے کہ میں اس کے مفہوم کو سمجھتا ہوں۔ بالفاظ دگر غیر عاشق صرف زبان سے (طوطے کی طرح) کہتا ہے کہ لا الہ الا اللہ۔ مگر عاشق زبان سے کچھ نہیں کہتا اپنی جان دے کر اپنے عقیدے کا اظہار کردیتا ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ عمل، قول سے زیادہ فصیح ہوتا ہے، زیادہ مؤثر ہوتا ہے اور زیادہ انقلاب انگیز ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سلطان فتح علی خاں المعروف بہ سلطان ٹیپو شہید نے اپنی جان قربان کردی مگر انگیز علیہ ما علیہ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ اگر سوچنے اور سمجھنے کی قوت ہو تو نظام علی خاں والیٔ مملکت حیدرآباد دکن اور فتح علی خاں والیٔ دولت خداداد دکن، دونوں کی دماغی ساخت، طبیعت کی افتاد، ذہنیت، زندگی کے متعلق زاویہ نگاہ بلکہ دونوں کے اسلام کا اندازہ ہوسکتا ہے اول الذکر کے نزدیک توحید صرف ایک '' مذہبی فارمولا '' تھا جسے گاہے گاہے زبان سے ادا کرلینا چاہئے۔ عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اسی لئے وہ زبان سے لا الہ الا اللہ بھی کہتا رہا اور ولزلی جیسے دشمن توحید کے آگے سر تسلیم بھی خم کرتا رہا یعنی عمل سے '' لا الہ الا ولزلی '' کا اثبات کرتا رہا اور جب وہ مرا تو امام مسجد نے اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی اور سب نے اس کے لئے دعائے مغفرت بھی کی —

کس قدر زبردست حماقت ہے جس میں ہم مسلمانان عالم صدیوں سے

مبتلا ھیں ! اسی افسوس ناک صورت حال کو دیکھ کر تو اقبال نے یہ شعر لکھا جس میں ھماری ھزار سالہ تاریخ مضمر ھے : ع

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ھے ؟ فقط ایک مسئلہ علم کلام

آمدم برسر مطلب ! چونکہ اسلام اور غلامی ایک دوسرے کی ضد ھیں اس لئے اسلام نے ھر قسم کی غلامی کے خلاف اعلان جنگ کیا ھے بلکہ بدلائل عقلیہ اس کا ابطال کیا ھے۔ صالحہ اقبال کہتے ھیں : ع

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ھر نوع غلامی کے لئے
نے کوی مغفور و خاقان، نے گدائے رہ نشیں

مسلمان جب تک زندہ ھے، یا آزاد رھتا ھے یا آزادی کے لئے جدوجہد کرتا رھتا ھے بس اسلامی زندگی کی یہ دو ھی صورتیں ھیں تیسری صورت کوئی نہیں ھے۔ اگر ایک مسلمان، غلامی پر قانع ھے تو سمجھ لو کہ اس کا ضمیر (شعور ذات) مردہ ھوچکا ھے۔ بات یہ ھے کہ عاشق کسی غلط (غیر اسلامی) نصب العین سے مفاھمت کرھی نہیں سکتا۔ اسلام کے علاوہ ھر نصب العین غلط ھے —

عشق کی دوسری خاصیت یہ ھے کہ اس کی بدولت عاشق، جبر کے دائرے سے نکل کر اختیار کی روح پرور فضا میں داخل ھوجاتا ھے۔ جبر، نام ھے خالق کائنات کی مشیت کا، جو اس کائنات میں کار فرما ھے۔ اقبال نے اس جبر حقیقی کی تصویر بایں الفاظ کھینچی ھے : ع

ذرہ ذرہ دھر کا زندانیٔ تقدیر ھے
پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ھے
آسماں مجبور ھے، شمس و قمر مجبور ھیں
انجم سیماب پا، رفتار پر مجبور ھیں
نغمہ بلبل ھو یا آواز خاموش ضمیر
ھے اسی زنجیر عالمگیر میں ھر شئ اسیر

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سر مجبوری عیاں
خشک ہوجاتا ہے دل میں اشک کا سیل رواں

لیکن جب ایک مسلمان مسلک عشق اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی مرضی، خالق کائنات کی مرضی میں فنا کردیتا ہے۔ عشق کا پہلا سبق، شیوۂ تسلیم و رضا ہے۔ اگر تصوف کی زبان سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھ لیجئے کہ عاشق اپنی مرضی کو اللہ کی مشیت سے ہم آہنگ کرلیتا ہے (فنا سے ہم آہنگی مراد ہے) اسی ہم آہنگی یا مطابقت کو تصوف کی زبان میں ''فنا'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہر کیف جب یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے تو عاشق، جبر کی دنیا سے نکل کر، اختیار کی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔ اسی نکتے کو اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے :—

بروں کشید ز پیچاک هست و بود مرا
چه عقده ها که مقام رضا کشود مرا

(زبور عجم)

جب عاشق اپنی مرضی اپنے محبوب (اللہ) کی مرضی میں فنا کر دیتا ہے یعنی شیوۂ تسلیم اختیار کرلیتا ہے تو محبوب، اپنے عاشق سے راضی ہوجاتا ہے۔ قرآن حکیم اس بات پر شاهد ہے '' رضی اللہ عنهم و رضوا عنه ،، اللہ ان (صحابہ سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے) جب یہ صورت پیدا ہوجاتی ہے تو محبوب، اپنے عاشق کی مرضی کو اپنی مرضی بنا لیتا ہے :—

صالحہ ارشاد ہوتا ہے '' فول وجهك شطرالمسجد الحرام،، (۲ — ۱۴۴) (بیشک ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کعبے کے قبلہ مقرر ہونے کے لئے بار بار آسمان کی طرف مونہہ کر رہے ہیں (چونکہ ہمیں آپ کی مرضی مد نظر ہے اس لئے آپ نماز میں کعبے کی طرف اپنا مونہہ کرلیا کریں)۔ اسی نکتے کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے : ع

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مرضی او ، مرضی حق می شود
ماه از انگشت او، شق می شود

اس اتحاد اور یکرنگی کا نمونہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے

صحابہ کے بعد صوفیائے کرام کی زندگیوں میں نظر آتا ہے کیونکہ یہ حضرات بھی فنا فی الرسول کی بدولت اس نعمت سے بہرہ اندوز ہوئے ہیں چنانچہ حضرت شیخ شیوخ عالم سیدی باوا فریدالدین گنج شکر فرماتے ہیں :—

" کامل تیس سال تک بندہ عاجز مسعود نے وہی کیا جو اس نے چاہا اب کچھ عرصے سے یہ کیفیت ہے کہ جو اس عاجز کے دل میں گذرتا ہے وہی ظہور میں آتا ہے "

دوسری مثال حضرت بوعلی قلندر پانی پتی کی زندگی سے مل سکتی ہے کہ انہوں نے سلطان علاؤالدین خلجی کو یہ خط لکھوایا تھا۔

باز گیر ایں عامل بد گوہرے
ور نہ بخشم ملک تو با دیگرے

(اسرار خودی)

غور طلب بات یہ ہے کہ اگر حضرت قلندر کو یہ یقین نہ ہوتا کہ جو کچھ میں چاہتا ہوں، خدا اسی کے موافق ظاہر کردے گا تو وہ اتنا بڑا دعوی ہرگز نہیں کرسکتے تھے۔ کیا آج کسی میں یہ ہمت ہے کہ بادشاہ وقت کو اس انداز کا کوئی خط لکھدے ؟

الغرض، عاشق، محبوب کی مشیت سے ہم آہنگ ہوکر، جبر سے نکل جاتا ہے، یعنی خدا کی مرضی کی تکمیل میں اس کا معاون بنجاتا ہے اور اس طرح اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کائنات میرے ارادے پر چل رہی ہے کیونکہ اس کا ارادہ، وہی ہوتا ہے جو اس کے محبوب کا ارادہ ہوتا ہے۔ اس طرح دوئی مٹ جاتی ہے اور عاشق کو یہ کائنات اپنی مرضی کے مطابق رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب عاشق اپنی مرضی، محبوب کی مرضی کے مطابق کردیتا ہے تو محبوب بھی عاشق کی مرضی کو اپنی مرضی بنالیتا ہے۔[1] اس طرح عاشق اور معشوق میں کامل اتحاد پیدا ہوجاتا ہے اور محبوب، عاشق کے فعل کو اپنا فعل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ " وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی " میرے دعوے پر شاہد عدل ہے۔

---

1. "The Creator too reconciles Himself to the purpose of the human self so that whatever it wills comes to pass" Ideology of the Future, p. 100, by Dr. M. Rafiuddin.

جب عشق کی بدولت، شعور ذات اپنے نقطہ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو عاشق کی مخفی قوتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں یعنی جس طرح خالق کائنات کے ارادے ہی سے شئی موجود ہوجاتی ہے۔ اسی طرح عاشق بھی جو زبان سے کہدیتا ہے اسی کے مطابق ظہور میں آجاتا ہے۔ یہ ہے راز معجزات اور کرامات کا۔ یعنی عاشق میں صفات ایزدی کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں : ع

هستی او بے جہات اندر جہات
او حریم و در طوافش کائنات
فقر مومن چیست ؟ تسخیر جہات
بندہ از تاثیر او مولی صفات

یعنی عاشق جبر اور تقدیر دونوں سے بالاتر ہوکر خود "تقدیر یزداں" بنجاتا ہے اسی لئے اقبال ہمیں یہ مشورہ دیتے ہیں :

عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

قصہ مختصر جب عاشق جبر سے نکل کر مختار بنجاتا ہے تو حالت یہ ہوتی ہے :

چو از خود گرد مجبوری فشاند
جہاں خویش را چوں ناقہ راند
نہ گردد آسماں بے رخصت او
نہ تابد اخترے بے شفقت او

(گلشن راز جدید)

الغرض جب عاشق میں صفات ایزدی کا عکس جلوہ گر ہوجاتا ہے تو وہ بقول ڈاکٹر رفیع الدین "کاملاً مختار ہوجاتا ہے۔ تقدیر اور جبر کی حدود سے باہر نکل جاتا ہے اور جو چاہتا ہے اس کے مطابق ظہور میں آتا ہے"[1] یہ ایک نئی زندگی ہے جو عاشق کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و سلم کی کامل اتباع کی بدولت نصیب ہوتی ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اسے فنا سے تعبیر کرتے ہیں ۔

---

1. Ideology of the Future p. 102

واضح ہو کہ یہ نعمت عظمیٰ جسے فنا سے تعبیر کیا جاتا ہے اس وقت حاصل ہوسکتی ہے جب انسان نفس امارہ کو مغلوب کرے یعنی اسے مسلمان بنالے، لیکن نفس کو مغلوب کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے جب تک ایک شخص کسی شیخ کامل کی صحبت اختیار نہ کرے اور اس کی ہدایت پر عمل نہ کرے نفس کو مغلوب نہیں کرسکتا۔ چنانچہ مرشد رومی فرماتے ہیں:

نفس نتواں کشت الا ظل پیر
دامن آں نفس کش را سخت گیر

کسی صاحب دل کی صحبت اختیار کئے بغیر انسان اپنی شخصیت کو ''گوہر'' میں تبدیل نہیں کرسکتا:

گر تو سنگ خارہ و مر مر بسوی
چوں بصا جلال رسی، گوہر شسوی

مرشد رومی کی تقلید میں اقبال مرحوم نے بھی ہمیں صحبت مرشد اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے:

شکوہ کم کن از سپہر گرد گرد
زندہ شو از صحبت آں زندہ مرد
صحبت از علم کتابی خوشتر است
صحبت مردان حر، آدم گر است
اے سرت گردم، گریز از ماچسو تیر
دامن او گیر و بے تابانہ گیر
می نروید تخم دل از آب و گل
بے نگاہے از خداوندان دل
اندریں عالم نیرزی باخسے
تا نیا ویزی بداماں کسسے (پس چہ باید کرد ص ۳۴)

افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ عقیدتمندان اقبال اس کے کلام کو پڑھ کر ذہنی مسرت یا لذت تو حاصل کرلیتے ہیں مگر اس کے مشورہ پر عمل کرنے سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ حالانکہ جب تک وہ تزکیہ نفس نہیں کریں گے (اور تزکیہ نفس، صحبت مرشد کے بغیر نا ممکن ہے) اس وقت تک اقبال کا خواب (تشکیل عالم قرآنی) شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا —

وما علینا الا البلاغ المبین